97

فلسفۂ مشرق

(عالمی فکری تناظر میں)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
اقبال اکادمی پاکستان
©2002-2006

ڈاکٹر آصف اقبال خان

98 G7

فلسفۂ مشرق

(عالمی فکری تناظر میں)

ڈاکٹر آصف اقبال خان

All rights reserved ©2002-2006

انسانی فکر کی حدود کا تعین ایک مشکل امر ہے اور تاریخ عالم میں اس نے اظہار کے بے شمار اسالیب اختیار کیے ہیں۔ ادب، فن، سائنس، مذہب، موسیقی اور تمدنی ارتقا کے دوسرے بہت سے مظاہر انسان کی اس امتیازی اہلیت اور استعداد کے رہین منت ہیں۔ فلسفہ ان میں بلاشبہ افضل اور احسن مقام کا حامل ہے اور اقوامِ عالم کے تہذیبی اور تمدنی ارتقا اور نشوونما کے ساتھ اس کا ایک ناقابلِ تفریق تعلق ہمیشہ قائم رہا ہے۔ اس لحاظ سے کسی بھی نظریاتی یا جغرافیائی گروہ کی علوم فلسفہ سے بے اعتنائی کو اس کے عقلی اور علمی دیوالیہ پن پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ دراصل کوئی بھی معاشرہ اپنے ایک مخصوص نظریۂ حیات اور فلسفۂ کائنات کے بغیر اپنا نظری تشخص متعین اور برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اور مختلف ادوار میں یہ تعمیری اور تخلیقی کام عموماً حکماء اور فلاسفر ہی سرانجام دیتے رہے ہیں۔

کسی بھی قوم کی فلسفیانہ فکر اس کے اجتماعی مزاج اور نظریاتی رجحانات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس کی ادبی، فنی اور مذہبی روایتوں کو متاثر کرتی ہے اور اخلاقی اقدار، معاشرتی اصولوں اور قانونی ضابطوں کی شکل میں مروج ہو کر افراد کی زندگیوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ نہ صرف زندگی کا بحیثیت مجموعی اظہار اور احاطہ کرتی ہے بلکہ کلیتاً اس پر اثرانداز بھی ہوتی ہے۔

بظاہر فلسفیانہ فکر کے دائرہ کار کا یہ خاکہ فلسفہ کی حیثیت اور اختیار کے بارے میں جدید رویوں کی عکاسی نہیں کرتا۔ عصرِ حاضر کے اثباتیت پسند فلسفی سائنسی فکر اور تجربی طریق کار کی فوقیت کو تسلیم کرتے ہوئے فلسفے کے لیے ایک نہایت محدود میدان عمل تجویز کرتے ہیں۔ مابعد الطبیعیات اور مذہب کو ناقابلِ تصدیق قرار دیتے ہوئے منطقی اثباتیت پسندوں اور دوسرے معاصر تجربیت پسندوں نے فکر

فلسفے کو محض لسانی تحلیل و تجزیہ Linguistic Analysis کا وہ ثانوی اور ضمنی کام سونپ دیا ہے جس میں کسی قوم کی بدیعی اور تخلیقی اختراع کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کے دور میں فلسفے کے لیے لفظی غدر باطل اور حجت لاطائل کے علاوہ کوئی اور فرض منصبی باقی نہیں رہا۔ کیا علمی تخصیص پسندی کے اس دور میں فلسفہ کے لیے کوئی نفسِ مضمون اور موضوع سخن مختص کرنا ممکن نہیں رہا؟ عصر حاضر کے دو مشہور مفکر وٹگن سٹائن اور روائٹ ہیڈ اسے الفاظ کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے علاوہ کوئی اختیار دینے کو تیار نہیں۔ اس کے برعکس پچھلے تیس سال کے دوران تجربیت کے کلاسیکل تصور کے خلاف اعتراض اور ردّ عمل کی ایک نئی تحریک نے بھی جنم لیا ہے۔ خود سائنسی نقطۂ نگاہ کے حامی، تجربیت کے بنیادی مفروضوں کو سائنسی طریق کار سے متصادم قرار دے رہے ہیں اور اس نظریہ کو غلط ثابت کیا جا رہا ہے کہ علم کی بنیاد عقل نہیں بلکہ تجربہ ہے۔ اس دوران میں کوائین، چومسکی اور کئی دوسرے معاصرین نے ہیوم اور اس کے متبعین کے روایتی فلسفۂ تجربیت کو تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا ہے۔

مذکورہ بحث سے قطع نظر فلسفے کو حدود و قیود کا تابع بنانا حقیقت سے پہلو تہی کے مترادف ہوگا۔ یہ درست ہے کہ آج کے دور میں اسے کیمیا، طبعیات، حیوانیات اور نفسیات جیسے ان علوم پر محتوی سمجھنا صحیح نہیں جو اپنے جداگانہ موضوعات اور اسالیب کی بناء پر خود مختار حیثیت اختیار کر چکے ہیں تاہم اس کا وہ روایتی رول اب بھی اتنا ہی ناگزیر اور اہم ہے جس میں یہ دوسرے علوم کے بنیادی مفروضوں اور اصولوں کی جانچ پڑتال کا حق رکھتا ہے۔ فلسفہ ان مضامین کی بنیادی اساس اور ماہیت کے بارے میں تحقیق و استدلال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پچاس سال کے دوران ریاضی، سائنس، تاریخ اور مذہب جیسے مکمل اور مختار علوم کے فلسفوں پر لاتعداد کتب اور مقالے تصنیف کیے گئے جو ان مضامین متعلق علم میں قابلِ قدر اور وقیع اضافہ ہیں۔ بلا شبہ فلسفہ کا طریق کار نظری اور فکری ہے اور وہ اپنے موضوعات کو منطق کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی جستجو میں گہرائی اور اس کے تجزیے میں صراحت بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ اس کا مطمع نظر حقیقت کی تلاش ہے نہ کہ ظاہر کا تجسس۔ اسی حوالے سے فلسفے میں صحیح فکر و استدلال کے لیے منطق اور اس فکر کی مخفی ساخت اور بناوٹ سمجھنے کے لیے نظریۂ علم Epistemology کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

فلسفہ کا روایتی تصور جس سے دورِ حاضر کے اثباتی اور سائنسی مفکرین چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس یونانی فلسفے سے اخذ کردہ ہے جس کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے علاقے

آئیونیا (Ionia) میں ہوا خود لفظ فلسفہ کا ماخذ اور منبع یونانی زبان میں پایا جاتا ہے جس کے مفہوم میں تمام علم و حکمت کا احاطہ کرنے کا دعویٰ بھی موجود ہے۔ یونانی فکر میں مابعدالطبیعیات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حقیقت کل کے ادراک اور احساس و تجربہ سے ماورا کی کھوج کے علاوہ اس کے ذمہ ان مسلمہ اصولوں کا تعین بھی تھا جو علم کو بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں یونانی فلسفیوں نے کائنات، انسان، خدا، حیات و ممات اور علم و اخلاق کی اصل نوعیت کے بارے میں بنیادی اور اساسی مباحث میں جوہر، زمان، مکان، روح، مادہ اور وجود جیسے ناقابلِ تصدیق مابعدالطبیعیاتی تصورات پیش کیے۔ مغرب کا فکری ارتقاء فلسفۂ یونان کے اسی فکری تناظر میں ہوا اور یہ روایت کانٹ اور ہیوم کی تنقید کے باوجود مغربی مفکرین میں اٹھارویں اور انیسویں صدی تک کسی نہ کسی صورت میں موجود و متمکن نظر آتی ہے حتیٰ کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ویانا سرکل Vienna Circle کے اثباتیت پسند اور سائنس نواز حلقوں نے منطقی اثباتیت اور لسانی تحلیل و تجزیہ کے ردّ اور ابطال کا بھرپور آغاز کیا۔

عیسائیت کی ترویج و اشاعت کا زمانہ دراصل یورپ میں فلسفہ کے انحطاط کا دور رکھا جاتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ اور نشاۃِ ثانیہ کا مغربی فلسفہ آٹھویں صدی بیسویں سے بلاواسطہ طور پر یونانی فکر سے متاثر ہوا اور مختلف صورتوں میں یونانی علوم کی تجدید و اعادہ میں مشغول رہا۔ چنانچہ مغربی مفکرین نے عموماً فلسفۂ یونان کے حوالے سے ہی اپنے مکاتیبِ فکر اور فلسفیانہ نظام تشکیل و ترتیب دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے تین سو سال کے دوران لکھنے والے اکثر مؤرخینِ فلسفہ یونانی فکر سے ابتدا کرتے ہوئے خود کو محض مغربی فلسفہ تک محدود کر لیتے ہیں اور مشرقی فکر کے اس خزانے کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس نے اسے صدیوں پہلے علم و ادب اور فکر و فلسفہ کے مقامات مرتفع پر فائز رکھا تھا کہ ان فکری اور تمدنی عناصر کو بھی جو بلاواسطہ طور پر یورپ میں احیائے علوم کا باعث بنے، فقط سطحی اور سرسری ذکر کے ساتھ موقوف کر دیا گیا۔ تاریخ کی اس یک طرفہ تعبیر نے مصری، ہندوستانی، چینی اور اسلامی فکر و فلسفہ کے تمدنی ورثہ کو تاریخ میں اس کا جائز مقام نہ دے کر علم و ادب اور حکمت و دانش کے ارتقا اور نشوونما کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مؤرخین کو اس کوتاہی کا احساس ہوا تاہم یہ شعور و آگہی اب بھی ماہرین کے محدود حلقوں کے علاوہ کم کم ہی نظر آتی ہے۔ نہ ہی مشرقی فلسفہ کو ابھی اس کی حیثیت اور مرتبہ کے مطابق تاریخی طور پر قبول کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے مسلم فلاسفہ کے علمی کارہائے نمایاں یونانی فکر کو مغرب میں روشناس کروانے میں ان کا رول، یورپ کی نشاۃِ ثانیہ میں ان کا بیش بہا حصہ

اور ڈیکارٹ سے کانٹ تک عموماً مغربی فلسفہ کو فکری تحریک بہم پہنچانے کا عمل پیہم، یہ تمام حقائق اب بھی مغربی تاریخ نویسی کی پرانی روش کی گرد میں چھپے ہوئے ہیں۔ دراصل مغرب میں فلسفۂ مشرق کی تقویم و تخمین سے پہلوتہی بہت سے عوامل کی مرہونِ منت ہے۔ ان کی تاریخ نویسی کی خطوطی Linear روایت کے علاوہ قدیم مشرقی فکر و فن سے لاعلمی بھی اس ناقدر شناسی کی وجوہ میں شامل ہے۔ لیکن نظری حوالے سے جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ مغرب میں کسی ایسی روایت کا فقدان ہے جس میں فلسفہ اور مذہب کا ایک ایسا امتزاج اور تعلق موجود ہو جو ایک مشترک محرک کے طور پر دو طرفہ فکری ارتقا کا باعث بن سکے۔ اس کے برعکس مشرقی فکر میں مذہب اور فلسفہ آپس میں یوں خلط ملط اور مربوط ہو جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے سمجھنا نہ صرف دشوار بلکہ تاریخی اور علمی لحاظ سے نامناسب ہوگا۔ مشرق میں اگر فلسفہ اور مذہب میں کسی موضوع پر اختلاف بھی پایا جاتا ہے تو اس کے باوجود بھی ان کا باہمی تقرب و تعلق ختم نہیں ہوتا۔ چنانچہ عموماً یہاں فلسفہ کو تصوف اور معرفت کے مسائل سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہاں علم الاخلاق اور تربیت کردار پر بھی خصوصی توجہ نظر آتی ہے۔ لہٰذا مشرقی فلسفہ میں زیادہ تر خود شناسی، خدا شناسی، تزکیۂ نفس، پاکیزگیٔ افکار و عمل جزا و سزا، نجات و شفاعت جیسے عملی مسائل بحث کا موضوع بنتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی فکر میں فلسفہ کو عموماً مابعد الطبیعیاتی استدلال، نظری اور عقلی تجزیہ یا پھر بیسویں صدی میں تجربی تصدیق Empirical Verification اور لسانی تحلیل و تجزیہ جیسے علمی مباحث تک محدود رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں جانب بنیادی تصورات ایک جیسے ہی ہیں یعنی حقیقتِ مطلقہ، مادہ، کائنات فرد وغیرہ۔ تاہم ان کا جداگانہ تناظر یں سیاق و سباق کا بُعد ان میں ایک مسلّم اور دور رس تفاوت اور تمیز کا باعث بنتے ہیں۔

اس تناظر میں فلسفۂ مشرق، مغربی مفکرین کے مقابلے میں اپنی ارتقائی منازل بہت پہلے طے کر چکا تھا۔ ہندوؤں کے ابتدائی مذہبی افکار اور چینی حکمت و دانش کو دنیا کے قدیم ترین فلسفیانہ فکر میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یونان میں فلسفہ کے آغاز سے بہت پہلے مصر اور عراق میں بھی علم و دانش کا ارتقا اس حد تک ہو چکا تھا کہ افلاطون اور ارسطو اسے علم و حکمت کا منبع قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح بابل اور نینوا کا تمدن تاریخی لحاظ سے بہت پرانا ہے اور اس کے فکری اثرات بعد کی تہذیبوں میں ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان قدیم افکار کے بارے میں ہمارا علم نہایت محدود ہے جس کی وجہ سے ہمارے سامنے اس زمانے کی فلسفیانہ سوچ کی کوئی واضح اور باقاعدہ شبیہہ نہیں بنتی لیکن کیا محض عدم واقفیت کو اس

صورتِ حال کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ کم از کم فلسفہ ہائے ہند و چین کے بارے میں ہم بڑی حد تک آگہی رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود فرینک تھلی جیسا مصنف اپنی کتاب "فلسفہ کی تاریخ" میں قدیم مصر کے علاوہ ہند و چین کے افکار کو بھی فلسفہ کی قلمرو سے اس بنیاد پر خارج کر دیتا ہے کہ اساطیری اور دیومالائی ادب کے تابع یہ نظریات منطقی خطوط پر قائم کوئی مربوط فلسفیانہ نظام پیش نہ کر سکے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا محض منطقی، عقلی اور سائنسی سوچ انسان کو فکری رفعتوں تک رسائی دلوا سکتی ہے؟ اور کیا باطنیت، تخیل اور جذبہ اس راہ کی رکاوٹیں ہیں۔

یہ درست ہے کہ ہندو فکر میں شاعری کی غیر منطقی اور علامتی زبان کا استعمال کیا گیا ہے اور ویدوں کی رسوم پرستی کے نتیجہ میں ہندو مذہب پر کرما، آواگون، مایا اور ذات پات کے منفی تصورات حاوی نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی بھگتی اور یوگا کی فکری تحریکوں نے ارفع مذہبی روحانیت کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ دراصل ہندو مذہب کی مذہبی اساس نے اسے اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ اس کا فلسفیانہ پہلو ابہام کا شکار ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے چھ مشہور روایتی مکاتبِ فکر اور چارواک، جین مت اور بدھ مت کے بین غیر مقلد اور آزاد خیال فکری نظام، فلسفۂ ہند کی کوئی واضح تصویر پیش کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ تاہم یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہندوستان کسی بھی قسم کی منظم فلسفیانہ سوچ سے بالکل عاری رہا۔ قبل مسیح کا ایک ہزار سال کا عرصہ اگر اپنشد اور دوسرے متحارب مکاتبِ فکر کا دور تھا تو قرونِ وسطیٰ میں راما نوج نے اپنی مذہبی فکر کو ایک منظم فلسفیانہ رنگ میں بیان کیا۔ اسی دور کا ایک بہت اہم فلسفی شنکر بھی تھا جس نے ہندوستانی فکر کے مختلف النوع عناصر کو ایک مربوط فلسفیانہ شکل میں پیش کیا۔

قرونِ وسطیٰ اور عصرِ حاضر کی ہندوستانی فکری تحریکوں پر اسلام اور دوسرے بیرونی عوامل کا واضح اثر موجود ہے۔ اس کے باوجود اس دعوے میں کوئی شک نہیں کہ قدیم وید کا علم منفی یا مثبت انداز میں فلسفۂ ہند کے تمام افکار و نظریات کو متاثر کرتا ہے۔ اس فلسفہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مذہب، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات اور نفسیات کا باہم ارتباط پایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں کرما، پراکرتی، مکتی وغیرہ تصورات بھی فلسفہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پہلے دو سو سال میں ہندوستان میں فکری اصلاح و ارتقاء کے ضمن میں بہت سی تحریکیں معرضِ وجود میں آئیں ہیں۔ اس کے باوجود دورِ جدید کا ہندوستانی فلسفہ بڑی سرعت سے اپنے قدیم مذہبی ماخذ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اور قدیم اپنشید اور ویدوں کی بنیادی تعلیمات کی اساس کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے عالمگیر سطح پر ان کی اشاعت

اور ترویج کی کوشش کی جا رہی ہے۔

فلسفۂ ہند کی طرح چینی فلسفہ کی ابتدا بھی تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں ہوئی۔ چین میں اس وقت چو خاندان Chou Dynasty کی حکومت تھی۔ لیکن حقیقی معنوں میں فلسفیانہ فکر کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا جس کے بعد کا تین سو سال کا عرصہ چین میں فلسفے کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ اس دوران کنفیوشس، تاؤ اور مین شس Mencius جیسے نابغہ مفکرین نے جنم لیا اور اپنے خیالات اور نظریات کو مرتب و مروج کیا۔ یہ عصر لیکن مفصل یونانی فلسفہ کی مانند علمی اور فکری لحاظ سے اسے چینی فلسفے کا کلاسیکل دور کہا جا سکتا ہے۔ درحقیقت یہ افکار صحیح طور پر چین کے مقامی علم و دانش کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور ان پر بدھ مت یا ہندوستان کے دیگر مابعد الطبیعیاتی اور مذہبی تصورات و عقائد کا اثر نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں ان افکار نے بعد کے چینی فلسفہ پر عمیق اثرات چھوڑے اور چینی ثقافت اور تمدن پر اُن کی اَن مٹ چھاپ اب بھی موجود ہے۔

قرونِ وسطیٰ کا چینی فلسفہ عمومی طور پر مقامی افکار اور بدھ مت کے ملاپ سے وجود میں آیا۔ چوتھی صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی تک کا زمانہ چین میں بدھ مت کی اشاعت و ترویج کا زمانہ ہے۔ حتیٰ کہ خود چینی مفکرین نے ان نظریات کو قبول کرتے ہوئے چینی بدھ ازم کی بنیاد رکھی۔ اس پس منظر میں بہت سے مکاتبِ فکر قائم ہوئے۔ جو ہنایانا Hinayana کی بہ نسبت مہایانہ Mahyana بدھ مت کے زیادہ قریب تھے۔ بدھ مت کے بہت سے عقائد کی تشکیل نو اور تکمیل چین میں ہوئی۔ مثال کے طور حقیقت کے کالعدم ہونے کا تصور، چونکہ یہ کسی بھی مخصوص وصف سے عاری ہے یا پھر عینیت Idealism کا انتہائی روپ جس میں حقیقت محض استحضار کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ لیکن یہ انتہا پسندی چینی فکر کے اصول اعتدال سے متصادم تھی۔ چنانچہ چینی مفکرین نے اپنے مؤقف سے موافق بدھ فلسفہ وضع کیا جس میں دونوں نقطہ ہائے نظر کے نمائندہ خدوخال کو متناسب نمائندگی دی گئی۔ اس اتصال کا سب سے انوکھا لیکن پُر معنی ماحصل چین میں (اور جاپان میں بھی) زین بدھ ازم کا اجرا تھا۔

کنفیوشس کے فلسفے کا احیا اور تشکیلِ نو (۹۶۰ء–۱۲۷۹ء) سنگ دور میں ہوئی۔ اس کا بڑا مقصد نظری اور تمدنی سطح پر بدھ مت کے منفی رجحانات کا ابطال تھا۔ بعد ازیں ۱۳۸۸ء سے ۱۶۴۴ء تک منگ دور اور پھر ۱۹۱۱ء تک چی اِنگ دور Chi-ing Period میں اس کی نشوونما اور عروج ہوا۔ اس فلسفے کے مرکزی اصول تائی چی یا عظیم عقلِ مطلق اور لی یا عقلِ انسانی ہیں۔ تائی چی کی تحریک سے حرکی اصول یانگ پیدا ہوتا ہے اور جب یہ حرکت اپنے انجام کو پہنچ کر سکونت اختیار کر لیتی ہے تو غیر متحرک

اصول ین جنم لیتا ہے۔ یانگ اور ین کے اس دائمی لیکن مخصوص تعلق سے آگ، پانی، مٹی، دھات اور لکڑی کے عناصرِ خمسہ پیدا ہوتے ہیں جن سے مادی دنیا کو وجود ملتا ہے۔

اس طریقے سے کنفیوشس کے پیروکار حقیقت کو بتدریج ارتقا پذیر مربوط نظام کی صورت میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اعلیٰ انسان کا ہر فعل انہی اصولوں کی ایک تمثیل ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک عالمگیر معنویت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک عام فرد اور انسانِ کامل میں بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ اپنے اس خصوصی ادراک کے ذریعے سے اپنے کردار کو نہ صرف اخلاقی فضائل سے مالامال کر لیتا ہے بلکہ اس سے بھی آگے ماورائیت کے درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ چینی فلاسفہ کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ زندگی کو ایک روزمرہ فطری حقیقت کے طور پر لیتے ہیں اور پھر اس میں روحانیت کا رنگ بھر کے اسے اعلیٰ و ارفع معانی پہنا دیتے ہیں۔ کنفیوشس کے افکار کی تشکیل نو میں اس مقصد کو بڑی خوش اسلوبی سے حاصل کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارھویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک یہی فلسفہ چین کی فکری پہچان رہا ہے۔ تاہم پچھلے سو سال کے دوران مغربی افکار کی یلغار کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے حالات کے پیشِ نظر ایک نئے فلسفے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

مسلم فلسفہ جسے تاریخی لحاظ سے فکرِ مشرق کا ایک حصہ قرار دیا جاتا ہے اس پر اساطیری اور دیومالائی میلانات کا الزام لگانا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین اور فلاسفہ اپنے فکری تعصب کے باوجود اسے نظر انداز کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ ظہورِ اسلام اور پھر اس کی اشاعت و ترویج اور تمدنی عروج تاریخِ افکارِ عالم میں ایک اہم اور فیصلہ کن موڑ کی مانند ہے۔ تاریخی اور علمی لحاظ سے اسلام نہ صرف تمام سابقہ مذاہب کے فکری اور نظری عناصر کو خود میں جذب کر لینے کی کماحقہ اہلیت رکھتا ہے بلکہ تاریخی تناظر میں ماضی کے تمام ادبی اور فکری سرمائے کی وراثت کا بھی حق رکھتا ہے۔ قدیم عراق، مصر، چین، ہندوستان اور یونان کے تہذیبی اور تمدنی مظاہر مسلم فلسفہ و علم کے لیے ایسا مواد مہیا کرتے ہیں جسے نقطۂ آغاز بنا کر مسلم حکماء اور فلاسفہ نے بدیع و جدید مکاتبِ فکر کی بنیاد رکھی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلم علم الکلام اور مابعد الطبیعیات کے بنیادی تار و پود یونانی علوم کے عرب پہنچنے پر پوری طرح واضح ہوتے ہیں۔ اسی طرح مسلم صوفیا مختلف حوالوں سے ہندو مت، بدھ مت اور دوسرے بیرونی عناصر کے زیرِ اثر محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کے تصوف اور فلسفیانہ نظریات کا خمیر خود دینِ اسلام اور دوسرے مقامی فکری عقائد سے اٹھایا گیا۔ بعد ازاں قرونِ وسطیٰ (ساتویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک کا زمانہ) کے مسلم مفکرین کے فکر و عمل میں تجربہ اور مشاہدہ کے سائنسی

طریق اس حد تک راسخ تھے کہ ایک طرف تو وہ بغیر کسی تعصب کے مخالف نظریات کی، ان کے جواز اور وقعت کے مطابق، توثیق یا تردید کرتے تھے دوسری طرف وہ کسی بھی مستحکم عقیدے کی دوبارہ جانچ پڑتال کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ اس رویّے کے رہنما اصول تجربیت، حقیقت پسندی اور عملی افکار تھے جس کے نتیجے میں وہ ایک متحرک ارتقاء پذیر کائنات کا تصور قائم کرکے مظاہرِ فطرت اور تاریخی عوامل کی تسخیر کو اپنا مطمحِ نظر سمجھتے تھے۔ اس طرزِ عمل کی ترغیب و تحریک قرآنِ حکیم کے نقطۂ نگاہ کی فعالیت اور اسلامی تعلیمات کے غیر کلاسیکی رجحانات سے ہوئی۔ چنانچہ اس وقت کا مسلم فلسفہ اس نظریہ پر قائم نظر آتا ہے کہ

"زندگی ایک ارتقائی تغیر کا عمل ہے جو دائم حرکت ہے۔"

اسلام کی اس انقلابی سوچ نے مسلم فلاسفہ کو فکرِ یونان کے سائنسی، منطقی اور مابعد الطبیعیاتی نظریات کے خلاف صف آرا کر دیا۔ ابنِ سینا نے باقاعدہ منطقی بنیادوں پر ارسطو کے مغالطوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور موجودہ عالم کا بغور جائزہ لے کر اہم منطقی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کی از سرِ نو تعبیر و تفسیر کی۔ خدا کے وجود کے بارے میں وہ اپنے نظریات میں جدید مغربی مفکرین ڈیکارٹ اور کانٹ کا ہم پلّہ نظر آتا ہے۔ النظام اور غزالی کا اصولِ تشکیک بھی ڈیکارٹ کے "میں جانتا ہوں اس لیے میں ہوں" کے نظریہ سے کئی سو سال پہلے وضع کیا گیا۔ اسی طرح الاشراقی، الرازی اور ابنِ تیمیہ کے نظریات میں عصرِ حاضر کی ارسطو کے ابطال کی تحریک کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ وہ ایک منظم علمی انداز میں یونانی منطق کی تردید کرتے ہوئے اس کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ خصوصاً ابنِ تیمیہ نے قیاس کی شکلِ اوّل ——— کو باطل ثابت کرکے اُسے اس بنیاد پر رد کر دیا کہ اس میں مغالطہ انحصار مقدمہ ——— بر نتیجہ Fallacy of Petitio Principii کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اس بارے میں یہی دلیل صدیوں بعد مِل نے بھی دی۔

عصرِ جدید کے تمدنی ارتقاء کے لیے مسلم فلاسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ سائنس یا استقرائی طریقے Inductive Method کی اختراع ہے۔ یوں تو اکثر مسلم مفکرین اپنی تحقیقات میں سائنسی طریقِ کار کا استعمال کرتے رہے لیکن ذکریا الرازی، ابنِ حزم، ابنِ ہیثم، ابنِ طفیل اور ابنِ تیمیہ ان میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ارسطو کے 'قیاس کی شکلِ اوّل' پر الرازی کی تنقید سراسر استقرائی انداز میں ترتیب دی گئی۔ ابنِ حزم کا حسّی ادراک پر زور دینا اور ابنِ تیمیہ کا استقرائی استدلال کو زیادہ معتبر سمجھنا بھی اس روایت کا حصہ ہے۔ ابنِ ہیثم کے خیال میں استقرائی طریقِ کار قیاسی استدلال سے بہتر ہے اور اس

بنیاد پر وہ ارسطو اور اس کے جانشینوں پر تنقید کرتا ہے۔ اس کے خیال میں سائنسی تحقیق کے لیے یہ ایک بنیادی اور لازمی ضرورت بھی ہے۔ ابنِ طفیل اپنی کتاب "حیّ ابن یقظان" میں اس طریقے کے استعمال کی دوررس نتیجہ خیزی کی طرف واضح اشارے کرتا ہے۔

ابن طفیل کی تجربیت پسندی اور الکندی، ابن سینا، البیرونی، الخوارزمی اور الرازی کی سائنسی تحقیقات سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ سائنس کا تجرباتی طریقہ Experimental Method محض مغرب کی اختراع نہیں ہے۔ بلاشبہ سائنسی سوچ کے حوالے سے مسلم مفکرین یونانی فلاسفہ کی نسبت سائنسی اور تجربی روایت کے زیادہ قریب تھے۔ عرب فلاسفہ کی اثباتیت، باریک بینی، تفصیل پسندی اور مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی علمی تحقیق و جستجو ان کے یونانی فلسفیانہ روایت سے بُعد کا ثبوت ہیں اور اسی انداز اور رویّے کی یورپ کو ترسیل مغربی نشاۃ ثانیہ اور جدید علوم کے احیاء کا بڑا سبب بنی۔ یہ درست ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے بعد طویل عرصے تک مسلم فلسفہ جمود کا شکار رہا اور آج تک ابن سینا، الغزالی یا ابن خلدون کے پایہ کا کوئی مفکر پیدا نہ ہوسکا۔ بایں ہمہ عصرِ حاضر میں شاہ ولی اللہ، عبدہٗ اور علامہ اقبالؒ جیسے مفکرین نے قرونِ وسطیٰ کی اسلامی فکری شمع کو حسبِ توفیق روشن رکھنے کی سعی کی۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم فلسفہ کی تشخیص اور پہچان بہرحال قرونِ وسطیٰ کے مسلم مفکرین کے درخشندہ دور سے ہی ہوگی۔ اور اسی حوالے سے دنیا کے فلسفہ میں اس کا مقام و مرتبہ متعین ہوتا ہے۔

از: ڈاکٹر آصف اقبال خان
وائس پرنسپل، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن
لوئر مال، لاہور

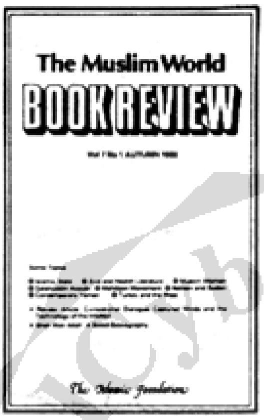

Hundreds of books are published every month from East and West on Islam and the Muslim world. It is humanly impossible for individuals to keep up with the information explosion. This unique quarterly publication of the Islamic Foundation aims not only to introduce but to give a comprehensive and critical evaluation of books on Islam and the Muslim world with due consideration to the Muslim viewpoint. The reviews are written by scholars of Islam and area specialists. The four issues are published in Autumn, Winter, Spring and Summer.

No scholar or library concerned with the contemporary world, whose future is now inextricably linked with that of the Muslim world, can afford to miss this important journal.

THE MUSLIM WORLD BOOK REVIEW

- Keeps abreast of important periodic literature on Islam and the Muslim world.
- Critically evaluates issues in important books through in-depth and short reviews.
- Contains comprehensive bibliographies on some important themes.
- Includes a classified guide to resource materials on Islam, cataloguing recently published books and monographs as well as articles on selected Islamic themes published in periodicals and other collective publications from all over the world.

SEND YOUR SUBSCRIPTION NOW

To: The Subscription Manager **Muslim World Book Review**

Please enter my subscription for MWBR. I enclose cheque/PO ....

for £/$ .... (Make cheque payable to the Islamic Foundation)

Name: ....

Address: ....

....

City Area Code County

(Please write in capital letters)

Annual subscription rates: Please tick.

	UK (postage paid)	OVERSEAS (by Airmail)
☐ Individuals	£13.00	£16.00 ($25.00)
☐ Institutions	£17.00	£20.00 ($32.00)
☐ Single copies	£4.00	£5.00 ($8.00)

Advertising — send for rates

THE ISLAMIC FOUNDATION

223, London Road, Leicester, LE2 1ZE. Tel: (0533) 700725

Note: The Islamic Foundation (one of Europe's leading publishers of Islamic books), has published over 100 titles on Islam for readers of all age groups. Some of the books are also available in German, French, Dutch, Portuguese and Spanish languages. For further information and a free copy of catalogue write to the Sales Manager at the above address.